Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 4, Issue3
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

ریحانہ کوثر
اسکالر پی ایچ۔ڈی اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
پروفیسر ڈاکٹر پروین اختر کلو
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں فلسفۂ اخلاق

Rehana Kausar
Scholar Ph. D Urdu, Government College University, Faisalabad
Professor Dr. Parveen Akhtar Kalu
Associate Professor, Department of Urdu, Government College University, Faisalabad

Moral philosophy in the novels of Deputy Nazir Ahmed
Nazir Ahmed's novels often encompass a philosophy of ethics that explores the complexities of human behaviour and moral dilemmas in a social and cultural context. Rooted in Islamic ethics and values, his writings explore themes of individual character, social responsibilities, and the tension between tradition and modernity. Nazir Ahmad's characters struggle with moral choices, between virtue, duty, and righteous living. reflect the complexities of achieving His novels highlight the importance of empathy, justice and compassion while criticizing social injustices. Overall, Nazir Ahmed's moral philosophy, as depicted in his novels, tries to reconcile religious principles with the challenges of a changing world, and urges readers to have a higher moral compass. Consider your actions, beliefs, and relationships in light.

Key Words: Novel, Moral Philosophy, Moral Dilemmas, Religion, Moral Stagnation, Modernity, Social Inequality.

کلیدی الفاظ: ناول، فلسفۂ اخلاق، اخلاقی مخمصے، مذہب، اخلاقی جمود، جدیدیت، سماجی عدم مساوات۔

کہانی ہر زمانے میں ادب کی ہر دل عزیز صنف رہی ہے اس لیے اس کی مقبولیت کے پیش نظر ہندوستانی ادیبوں نے بھی زندگی کی حقیقتوں اور اپنے تخیل کو قصوں میں پیش کیا۔ نذیر احمد وہ پہلے اردو ناول نگار ہیں جنھوں نے اصلاحی ناول لکھے اور انھوں نے زندگی کے حقائق و مسائل اور انسانی غموں اور خوشیوں کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ ان کے دور میں متضاد معاشرتی رویے پنپ رہے تھے ایک طرف تو اس عہد کے عوام توہمات کا شکار تھے تو دوسری طرف اشرافیہ مغرب کی تقلید ہی کو زندگی کا معیار سمجھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے ناولوں کو معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بنایا اور اسی لیے انھوں نے معاشرے کی اصلاح کے لیے تعلیم نسواں پر زور دیا۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں مختلف اخلاقی نظریات کو پیش کیا۔ ان کی تخلیقات اسلامی تعلیمات کے تناظر میں اخلاقیات سے متعلق موضوعات کی پیش کش کے سلسلے میں خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں نذیر احمد کے ناول اکثر عام مسلمانوں کی زندگیوں میں اخلاقی مخمصوں اور لوگوں کو درپیش چیلنجوں کے بارے میں ایک دریچہ فراہم کرتے ہیں۔

ایک وقت تھا جب اردو داستانوں میں جنوں، بھوتوں اور پریوں کا ذکر عام تھا۔ لوگوں کو ماورائے حقیقت کہانیاں پڑھنا اچھا لگتا تھا۔ تاہم یہ رجحان اس وقت تبدیل ہو گیا جب ۱۸۶۹ء میں ''مراۃ العروس'' شائع ہوا۔ دو بہنوں کی عادات واطوار کے عکاس اس ناول نے ادب کا دھارا ہی بدل کر رکھ دیا۔ ''مراۃ العروس'' کے ذریعے قارئین پہلی دفعہ ایسے کرداروں سے آشنا ہوئے جن کی اچھی، بری صفات اس سماج سے کشید کی گئی تھیں کہ جن کا وہ خود حصّہ تھے۔ اس ناول میں پیش کیے گئے واقعات اس زمانے میں گھر گھر کی کہانی تھے۔ نذیر احمد کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان تمام قصّوں میں ہماری معاشرتی زندگی کی بالکل سچّی تصویر کشی کی ہے ۔ یہ ناول دو بہنوں اکبری اور اصغری کے قصّے پر مشتمل تھا جن کی شادیاں دو بھائیوں محمد عاقل اور محمد کامل سے ہوئی تھیں۔ اکبری تعلیم و تربیت اور تہذیب سے ناآشنا اور بد تمیز اور پھوہڑ تھی۔ اصغری نے اس کے برعکس طبیعت پائی تھی اور وہ انتہا درجے کی سلیقہ مند اور سمجھ دار تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے اس ناول کا بنیادی پس منظر اخلاقی تربیت اور اصلاح ہے اس ناول میں دہلی کے معزز گھرانوں کے معاشرے کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور اس سلسلے میں محنت، مشقت، سادہ معاشرت، کفایت شعاری، ایثار و قربانی اور خدمت اور حسن سلوک کو مادی فلاح کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

یہ ناول ایک خاص ثقافتی اور سماجی تناظر کی عکاسی کرتا ہے اس لیے صنفی کرداروں اور ذمہ داریوں کے بارے میں جدید نظریات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ معاشرے میں افراد کے کردار اور توقعات وقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتی اور ارتقا پذیر رہتی ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناول ''مراۃ العروس'' میں اخلاقی ذمہ داری کے تصور اور معاشرے کے تئیں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو نبھانے کی اہمیت کی وضاحت کی اور کئی ایک مثالی کرداروں کی مدد سے انھیں اجاگر کیا۔ ان کے پیش نظر اہم فکری مسائل میں سے ایک مسئلہ اسلامی اخلاق کی ترویج کا تھا اور جس کے فقدان کا سامنا اس وقت کے معاشرے میں افراد کو تھا اور یہ کہ ان کے اعمال خود ان پر اور دوسروں پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کے نظریہ اخلاق کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

''دنیا کے تمام تعلقات صرف اتنے واسطے ہیں کہ آدمی ایک دوسرے کو فائدہ پہنچائے ہم چند روز کے واسطے کسی مصلحت سے اس دنیا میں بھیجے گئے ہیں اور یہاں ہم کو کسی کا باپ کسی کا بیٹا کسی کا بھائی بنا دیا ہے اس واسطے کہ لوگ ہماری اور ہم لوگوں کی مدد کریں اور صلح کاری اور ناسازگاری میں اپنی زندگی جو مقرر کر دی گئی ہے پوری کر جائیں۔ دنیا ہمارا گھر نہیں ہے۔ ہم کو دوسری جگہ جا کر رہنا ہو گا نہ کوئی ہمارا ہے، نہ ہم کسی کے ہیں۔ ہم اگر کسی کے باپ ہیں تو صرف چند روز کے واسطے اور اگر کسی کے بیٹے ہیں تو بھی چند روز کے واسطے۔'' (1)

انھوں نے مسلم خواتین کی اخلاقی تربیت کے ہدف کے حصول کے لیے جس مثالی کردار کو پیش کیا ہے اصغری کا کردار ہے۔ اس کردار کی مثالیت پسندی نے اسے ایک جیتے جاگتے انسان کے بجائے فرشتوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''افسوس ہے کہ اُسے عورت نہیں بنایا، وہ متین، خاموش، معاملہ فہم سلیم المزاج، ایثار پیشہ لڑکی ہے جسے، بچپن میں سوائے پڑھنے اور گھر کے کام کے کسی اور کام سے دلچسپی نہیں۔۔۔۔۔۔ وہ ہر دور اور ہر زمانہ میں معقول اور متین نظر آتی ہے۔۔۔۔۔ جوان ہو کر جب اس کے سینے میں جذبات شباب کا ایک طوفان موجزن ہوتا وہ ضبط اور پابندی کی ایک تمثال نظر آتی ہے۔ اس کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔'' (2)

ڈپٹی نذیر احمد اس خیال کو اجاگر کرتے ہیں کہ جو لوگ اپنی زندگی اخلاقی اصولوں پر گزارتے ہیں وہ ان لوگوں کی نسبت زیادہ خوش اور مطمئن ہوتے ہیں جو ان پر عمل نہیں کرتے۔ مراۃ العروس صنفی ذمہ داریوں کے متعلق پیغام دیتا ہے جو کہ اخلاقی فلسفے کا ایک اہم پہلو ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اس خیال کو فروغ دیتے ہیں کہ صنفی حدود کے اندر رہ کر انسانی مساوات کو ایک بنیادی اخلاقی اصول کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے ڈپٹی نذیر احمد کا خیال ہے کہ مضبوط اخلاقی اقدار والا خاندان اپنے ارکان اور جس معاشرے میں وہ رہتے ہیں اس کی کردار سازی میں اہم ذمہ داری ادا کر سکتا ہے۔

ناول کے اہم موضوعات میں سے ایک اسلامی اخلاقی نظریہ ہے۔ مصنف نے زندگی کے ہر پہلو میں اسلامی تعلیمات اور اصولوں پر عمل کرنے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ ناول کے کرداروں کو ایسے افراد کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو اسلامی اقدار اور اخلاقیات کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اصغری کا کردار، ایک پرہیز گار خاتون، اسلامی تعلیمات اور اخلاقی اقدار کا مجسمہ ہے۔ ناول میں پیش کیا گیا ایک اور موضوع انفرادیت بمقابلہ اجتماعیت کا تصور ہے۔ ناول میں اس خیال کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ انفرادیت اور اجتماعیت ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں، بلکہ ہم آہنگی کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔

اسی کے تسلسل میں ۱۸۷۲ء میں ''بنات النعش'' ناول لکھا گیا۔ یہ ناول مراۃ العروس کا دوسرا حصہ ہے۔ جس میں وہی اسلوب، وہی زبان، وہی مضمون ہے۔ ''مراۃ العروس'' سے مراد لڑکیوں کی تعلیم و تربیت، اخلاق اور خانہ داری تھی۔ اس ناول کا مقصد بھی یہی ہے۔ اس ناول کے ذریعے نذیر احمد نے گھریلو زندگی میں خواتین کی قدر اور مردوں کی زندگی کو سنوارنے میں ان کے کردار کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ حسن آرا کے کردار کے ذریعے نذیر احمد نے معلومات عامہ بھی پیش کی ہیں۔ انسانی ہمدردی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''حسن آرا: بھلا میں دیانت بیگم کی کچھ نیکیاں سنوں۔ کون سا لنگر تقسیم کرتی ہیں، کوئی سرائے مسافروں کے آرام کو بنوادی ہے، جنگل میں پیاسوں کے واسطے کوئی کنواں کھدوایا ہے، کسی

بیوہ کی تنخواہ کر رکھی مسجد کے مسافروں کا کھانا مقرر ہے۔

محمودہ: کیا بس یہی نیکیاں ہیں؟ یہ وہ نیکیاں جو دولت مندوں کے حصہ میں ہیں۔ اب میں دیانت کی نیکیاں گنواؤں۔ دیکھیے اس قدر تو غریب ہے کہ ماما گری کرتی ہے مگر اتنی بڑی ایماندار ہے کہ لاکھ کو خاک سمجھتی ہے۔ چھ چپاتیاں صبح چھ شام اس کو یہاں سے ملتی ہیں۔ پانچ کبھی چار آپ کھاتی اور ڈیڑھ ایک ضرور خدا کے نام مسجد میں دے آتی ہے۔ اس کی یہ ایک چپاتی آپ کے لنگر سے کہیں زیادہ ہے۔"(3)

"توبۃ النّصوح" ڈپٹی نذیر احمد کا ایک شاہکار ناول ہے۔ یہ ناول مکالماتی ہے اور ایک خاندان کے افراد کے اطوار اور کردار اس کا موضوع ہیں اور اسی خاندان کے بزرگ کے توبہ کے واقعات کو عبرت کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کی کہانی میں ایک بار "نصوح" ہیضے میں مبتلا ہوتا ہے اور بستر پر بے ہوش پڑا اپنی آخرت کو خواب میں دیکھتا ہے اور جب وہ ہوش میں آتا ہے تو اپنے گناہوں سے سچے دل سے توبہ کرتا اور مستقبل میں اپنی زندگی مذہبی تعلیمات کے مطابق گزارنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ساتھ مختلف گناہوں میں مبتلا اس کے تمام بچوں کو ان کی اصلاح پر توجہ دینے کی تلقین کرتا ہے۔ چھوٹے بچے تو جلد ہی اپنی اصلاح کر لیتے ہیں لیکن بڑوں میں تبدیلی نہیں ہوتی کیونکہ ان کی عادتیں پختہ ہو چکی ہوتی ہیں۔ اس کشمکش کی وجہ سے نصوح کا بڑا بیٹا کلیم اپنے والدین کو چھوڑ کر گھر سے چلا جاتا ہے۔ اس کا مقصد فوج میں بھرتی ہونا تھا تاہم مجرمانہ سرگرمیوں میں مبتلا ہو کر وہ زخمی ہو کر گھر لوٹتا ہے اور مر جاتا ہے۔ اس ناول میں گھریلو اور اخلاقی ناہمواریوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ کہ بچوں کو راہ راست پر کیسے لائیں؟ اس ناول کا ایک دلچسپ کردار مرزا ظاہر دار بیگ بھی ہے۔ کلیم گھر سے نکل کر اسی کے ساتھ رہنے لگتا ہے اور اسے جیل جانا پڑتا ہے۔ یہ ناول مکالماتی انداز میں تحریر کیا گیا ہے اس لیے یہاں اک مکالمے کو ان کے نظریہ اخلاق کے پیش نظر بطور مثال پیش کیا جا رہا ہے:

"نصوح: 'لیکن اگر میں اپنے کام پر آمادہ سرگرم ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ میں کہوں اور نہ سنیں، میں چاہوں اور نہ کریں، آخر میں ان پر ضابط تھا، میں ان پر ہر طرح کی قدرت رکھتا تھا اور نہ صرف ان پر بلکہ تم پر اور سارے گھر پر۔'

فہمیدہ: 'پھر بھی جس قدر برائیاں مجھ پر ظاہر ہوتی رہتی تھیں ان کا شاید دسواں حصہ بھی تم پر منکشف نہ ہوتا ہوگا۔ جان بوجھ کر میری عقل پر پردہ پڑ گیا، دیکھتے بھالتے میں اندھی بنی رہی۔ اب بھی جو جو خرابیاں ان کی میں جانتی ہوں تم کو معلوم نہیں۔"(4)

"فسانۂ مبتلا" (۱۸۸۵ء) میں شائع ہونے والا ناول ہے جسے تعداد ازدواج کی مخالفت میں لکھا گیا ہے اور اس میں مقصدیت آخر تک نظر آتی ہے۔ اس ناول میں ایک پرانے جاگیر دار طبقے کو دکھایا گیا ہے، جس کی توانا علامت عزت بیگم ہے، مبتلا ایک عیاش شخص ہے جو اس طبقے کی نمائندگی اسراف سے کرتا ہے اور ہریالی جو اسی معاشرے کے پست طبقے (طوائف طبقے) کی ایک فرد ہے سلقہ مندی میں عزت بیگم سے بہتر ہے۔ اسی طرح انھوں نے اپنے عہد کے نچلے متوسط طبقے کی پیشکش کے ساتھ ساتھ اس کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں سماجی عدم مساوات اور محنت کش طبقے کے استحصال کے مسئلے پر بات کی۔ ان کے ناول تمام انسانوں کے ساتھ عزت اور احترام کا برتاؤ کرنے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں چاہے ان کی سماجی حیثیت یا پیشے کچھ بھی ہوں۔ ناول کے مرکزی کردار مبتلا کی پرورش اچھے طور سے نہیں ہوئی۔ والدین یہ سوچ کر اس کی شادی کر دیتے ہیں کہ شاید وہ شادی کے بعد سدھر جائے مگر وہ ایک عورت ہریالی کو ماما کے طور پر گھر لے آیا تھا۔ آخر میں سب کو پتا چل جاتا ہے کہ اس نے تو شادی کی ہوئی ہے جس سے سوتنوں کے جھگڑے بڑھتے ہیں، مبتلا گھل کر مر جاتا ہے۔ اس ناول کے کرداروں میں مبتلا، میر متقی، غیرت بیگم، ہریالی، سید حاضر، سید ناظر اور عارف ہیں۔

نذیر احمد کے ناولوں میں 'مشترکہ خاندان' کی حیثیت بنیادی ہے، جن کی فضا پر سخت قسم کا پُراناڈ سپلن طاری ہے۔ ان کے کرداروں پر سب سے پہلے خاندان اور پھر سماج کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ المیے کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب ان میں سے کسی میں کوئی کسر رہ جائے اور یہی المیہ ان کی ہر کہانی کی وجہ جواز ہے۔ نذیر احمد ریاست و امارت کے مخالف نہیں، اس سے پیدا ہونے والی بُرائیوں کے مخالف ہیں اور اس کا علاج ان کے نزدیک یہ ہے کہ خواہ آپ نئی روشنی کے کتنے ہی دلدادہ ہوں، سماجی اور اخلاقی بندشیں ڈھیلی نہ ہونے دیں۔ اگر یہاں چوکے تو سب کچھ ہاتھ سے گیا۔ ناول کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"مبتلا تھا تو تخلص، مگر چوں کہ پھبتا ہوا تھا، ایسا مشہور ہوا کہ اصلی نام کو دور کے رشتہ دار تک بھی نہیں جانتے تھے اور مبتلا کے نام سے لڑکے شہر کے تمام گلی کوچوں میں، جب تک امرد رہا غزلیں اور واسوخت، جوان ہوا تو گیت اور ٹھمریاں، بوڑھا ہوا تو اس کے مرثیے پیچھے بھی مدتوں تک مرثیے اور نوحے گاتے اور پڑھتے پڑے پھرتے تھے۔ ہمارے یہاں کی شاعری میں عشق بازی اور بدتہذیبی کے سوا ہے کیا۔ شریف خاندانوں کے نوجوان لڑکے اکثر اسی مکتب سے خرابی کے لچھن سیکھتے اور اسی اکھاڑے میں برے کوتکوں کی مشق بہم پہنچاتے ہیں۔"(5)

یہاں بھی انھوں نے انسانی اخلاق کی تراش خراش مذہب کی مدد سے کی ہے اور انسان کو مہذب بنانے میں انھوں نے روایتی معاشرتی اقدار کی اہمیت کا اجاگر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ضبطِ نفس جو انسان کی اعلیٰ ترین خوبیوں میں سے ایک ہے اسے اپنانے کی تلقین کی ہے:

"سب سے بڑا فائدہ جو مصیبت سے انسان کو پہنچتا ہے۔ یہ ہے کہ مصیبت دل میں بالتخصیص عجز و انکسار کی صفت پیدا کرتی اور خدا کو یاد دلاتی ہے اور حقیقت میں مصیبت کے وقت بندہ خدا

کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ مصیبت نہیں رحمت ہے۔۔۔۔یہ تو درجہ رضا اور تسلیم کا ہے اور اسی کا نام صبر جمیل ہے اور آدمی کہ جس کا عقیدہ ضعیف اور دل کمزور اور جس کی ہمت کوتاہ اور جس کا ارادہ متزلزل ہے اس درجے پر پہنچنا دشوار ہے۔ مگر اعلیٰ علیین پر نہیں پہنچ سکتے تو ایک سیڑھی دو سیڑھی جتنا ہو سکے کچھ تو اُچکو کسی قدر تو ابھرو کہ اسفل السافلین کفران سے نکلو۔"(6)

نذیر احمد کا بنیادی مقصد مسلم معاشرے کی اصلاح تھا اس لیے وہ اسلام کے فلسفۂ اخلاق سے غافل نہیں ہوئے اور انھوں نے مغرب کے اخلاق کی نقالی سے مسلمانوں کو بچانے کی بھرپور شعوری کوشش کی اور فسانۂ مبتلا کے بعد ان کا مشہور ناول "ابن الوقت" (۱۸۸۸ء) قارئین کے سامنے آیا اور اسے بھی پسندیدگی کی سند ملی۔ قلم کے ذریعے اصلاحِ معاشرہ نذیر احمد کا بنیادی مقصد تھا اور انھوں نے اپنے اس مقصد سے ایک لمحہ بھی روگردانی نہیں کی۔ تاہم کمال یہ کیا کہ اپنے اردگرد کی فضا کو اپنے مشاہدے اور مکالمے سے تبدیل کرنے کی شعوری کوشش کی۔

"نذیر احمد کا دور (جیسا کہ ظاہر ہے) عبور اور تداخل کا دور تھا اور ابن الوقت اس دورِ تداخل کے عام افکار اور عام شکوک واوہام کا شفاف آئینہ ہے جس میں اس عصر کی ذہنی کشمکشوں کا پورا پورا واضح نقشہ روشن ہو کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔۔۔۔انگریزوں کے خیالات، رعایا کے احساسات، سیاسیات و مذہب کے نئے نئے تصورات اور ان کے زیرِ اثر ہندوستانیوں کے نئے نئے تہذیبی اور مجلسی رجحانات، ان سب موضوعوں کو گفتگو اور مکالمے کی صورت میں بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔"(7)

ابن الوقت کا کردار جدید تہذیبی قدروں کو پیش کرتا ہے جبکہ حجۃ الاسلام مشرقی تہذیبی اقدار کا نمائندہ ہے۔ اس دور میں ہندوستان کے مسلمان انگریزی حکومت اور سرسید احمد خان کی مساعی کی بدولت ایک حد تک تعلیم یافتہ ہوئے اور تین گروپوں میں تقسیم ہو گئے۔ اس ناول میں انگریزی طرز معاشرت کی اندھی تقلید کی مذمت کی گئی اور دکھایا گیا ہے کہ دوسروں کے کلچر کی تقلید کرنے والا بالآخر پچھتاتا ہے۔ ابن الوقت انگریزوں کی نقالی کرتا ہے اس کے بھائی حجۃ الاسلام نے اسے بہت سمجھاتا ہے مگر وہ باز نہیں آتا اور آخر کار اس کو شرمندہ ہونا پڑا۔ اس ناول کے دیگر اہم کردار نوبل صاحب اور مسٹر شارپ ہیں۔ نذیر احمد اسلامی نظریہ اخلاق کو حتمی اور کامل سمجھتے تھے اس لیے ان کا کردار حجۃ الاسلام اسی نظریے کی تبلیغ کرتا نظر آتا ہے۔ کسی قوم کی اخلاقی میدان میں تقلید اپنے نظریۂ حیات اور فلسفۂ اخلاق کو کمتر تسلیم کرنے کے مترادف ہے اور نذیر احمد جیسا جید عالم اپنی قوم کو اس احساسِ کمتری سے بچانے کی کوشش میں تھا۔

"ابن الوقت' بھی نذیر احمد کا بہت مشہور ناول ہے، جس میں مغربی تہذیب و تمدن کی نقالی پر طنز کیا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں اس میں سرسید احمد خان کو تضحیک کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ مگر ڈپٹی نذیر احمد نے اس کی تردید کی ہے کیوں کہ وہ خود سرسید کی تحریک سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ سرسید کے مشن کی تبلیغ اور ترویج کے لیے ہمیشہ سرگرم رہتے تھے۔ وہ سرسید کے تمام نظریات اور تصورات کے قدرداں تھے اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے اہم قومی خدمات بھی انجام دی ہیں۔"(8)

نذیر احمد مغرب کی ان ایجادات کو جو عقل کی توانائی اور زندگی کو منطقی طور پر دیکھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کو اختیار کر لینے میں ملک اور قوم کی ترقی جانتے تھے۔ جبکہ مغرب کی ہر میدان میں اندھی تقلید خاص طور پر اخلاق کے میدان میں بے جا پیروی سے روکتے تھے کہ مغربی زندگی کا سیلاب اپنی رو میں مشرقی تہذیب، مشرقی تمدن اور سب سے بڑھ کر مذہبی اقدار کو بہائے لے جا رہا ہے اور ہندوستانی مسلمان اپنے نظریۂ زندگی اور فلسفۂ اخلاق سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ انگریزی وضع کو اختیار کر کے مذہبی احکام کی بجاآوری ناممکن ہے اس لیے وہ ابن الوقت میں ابن الوقت کے انگریزی وضع اختیار کرنے کے بعد جو تبدیلیاں ہوئی ہیں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الغرض انگریزی سوسائٹی میں داخل ہونے کے خبط نے اس کو ایسا بے چین کر رکھا تھا کہ دن رات دو چار منٹ کے لیے بھی شاید اس کو خوشی ہوئی ہو ورنہ جب دیکھو منقبض جب سنو آزردہ ذرا سوچنے اور خیال کرنے کی بات ہے کہ جو شخص دنیا میں اس قدر من موہک ہو اس کو رمن داری سے کیا سروکار سچی دینداری کی شناخت ہے زہد، جتنا جس سے ہو سکے۔"(9)

اس ناول کا ایک اہم کردار حجۃ الاسلام جو مذہبی طور پر کٹر ہے لیکن اپنے عہد کی روح کو سمجھنے سے بڑی حد تک قاصر ہے وہ اس ناول میں ایک طویل تقریر کرتا ہے اور سطحی سائنسی معلومات کی مدد سے مذہب کی حقانیت کا استدلال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ البتہ وہ روایتی مذہبی اخلاقیات پر یقین رکھتا ہے اور انسانی فطرت میں اعلیٰ اخلاق کی حکمت کو مانتا ہے۔ وہ عاجزی اور انکساری کو انسانی فطرت کی مثبت تشکیل کے لیے ضروری خیال کرتا ہے اور کہتا ہے:

"دین کے اعتبار سے ہم تم دونوں بیمار ہیں فرق اتنا ہے کہ تم اپنے تئیں بیمار نہیں جانتے تمھاری بیماری درجہ درارت کو پہنچ گئی ہے اور تم کو خبر نہیں تم نے علاج کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ میں بیماری کو سمجھتا ہوں گر افسوس ہو کہ طبیب نہیں لیکن جس طرح دائم المرض اپنا علاج کرتے کرتے بعض دواؤں کی خاصیتیں جانتے پہچانے لگتا ہے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تم کو طبیعت میں انکسار پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور یہ ساز و سامان اور توزک و احتشام اور امارت اور حکومت یعنی لوازم رعونت سب سخت درجے کی بدپرہیزیاں ہیں جن کے رہتے طبیعت میں انکسار کا پیدا ہونا محال نہیں تو مشکل ہونے میں کچھ شک بھی نہیں۔"(10)

وہ اپنے طور پر اخلاقی بیداری کے تصور اور انسانی رویے کا اندازہ لگانے میں مذہب کے کردار کو اجاگر کرتا ہے۔ بیماری کی تشبیہ سے مراد اخلاقی بیماری ہے، اس کے مطابق

افراد کو ان کی اخلاقی کوتاہیوں کی وجہ سے ''بیمار'' سمجھا جاتا ہے۔ مذہب ایک تشخیصی آلے کے طور پر کام کرتا ہے جو دونوں افراد میں اس اخلاقی بیماری کی نشاندہی کرتا ہے ۔ وہ اخلاق کی نوعیت کے بارے میں سوالات اٹھاتا ہے اور اس حد تک کہ لوگ اپنی اخلاقی ناکامیوں کو کس حد تک پہچان سکتے ہیں۔ خود آگاہی اور خود مختاری اخلاقی طور پر ذاتی ترقی کا باعث بن سکتی ہے۔ مزید برآں اس کے نزدیک منفی عادات یا طرز عمل کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ اخلاقی خامیاں گہری ہیں اور ان پر قابو پانا مشکل ہے۔ وہ اخلاقی بیداری، مذہبی رہنمائی، خود کی بہتری اور اخلاقی جمود کے درمیان پیچیدہ تعامل کو پیش کرتا ہے۔

نذیر احمد کا ایک اور اہم ناول ایامیٰ ناول ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔

''ایامیٰ اصل میں ایایم تھا' جیسے یتامیٰ کی اصل یتایم تھی ایم کی جمع ایامیٰ ہے ایم اس مرد کو بھی کہتے ہیں جس کی بیوی نہ ہو اور اس عورت کو بھی کہتے ہیں جس کا شوہر نہ ہو۔''(11)

اس ناول میں انھوں نے ایک شرعی مسئلے کی عدم تعمیل کی وجہ سے پیدا شدہ سماجی تشدد کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں میں ان کے خود ساختہ مذہب اور رسم و رواج کی پابندیوں کے باعث اکثر بیوہ عورتیں عقدِ ثانی سے محروم رہتی ہیں اور اس بنا پر ان کی زندگیاں مشکل ہو جاتی ہیں۔ ایسی ہی زندگی کا المناک نقشہ نذیر احمد نے یہاں پیش کیا ہے۔ مولوی نذیر احمد اس ناول سے پہلے بھی اس مسئلے پر آواز اٹھا چکے تھے۔ اس ناول میں انھوں نے بیوہ عورتوں کی مشکلات کو سامنے لائے ہیں۔ آزادی بیگم جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی اس نے بیوگی کا درد سہا تھا اس لیے وہ خود کو بیوہ عورتوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ لوگوں کی توجہ کو اس معاملے طرف متوجہ کرتی ہے اور مرنے سے پہلے ان کی بدحالی کو بیان کرنے لے لیے دردناک تقریر کرتی ہے۔ اس ناول کے اہم کردار آزادی بیگم، خواجہ آزاد اور ہادی بیگم ہیں۔ یہ ناول انیس فصلوں پر مشتمل ہے۔ یہ ناول اس جملے سے شروع ہوتا ہے:

'' شہر محلے اور خاندان کا کیا مذکور ہے، گھر بھی کوئی ایسا ہی اکا دکا ہو گا جس میں بوڑھی یا ادھیڑ (افسوس) یا (ہائے) لڑکی بیوہ نہ ہو۔''(12)

آزادی کا باپ خواجہ آزاد اس ناول میں انگریزی حکومت کی برکتوں کی تشہیر اور اس کا دفاع اپنا اخلاقی فرض سمجھ کر کرتا ہے۔ اس دفاع سے اسے صرف نفسیاتی تسکین ہی ملتی ہے معاشی طور پر کچھ نہیں۔ اس کی بیوہ ہادی بیگم مولویوں کے خاندان سے تھی اس لیے مذہبی خیالات میں سخت تھی۔ یوں آزادی کی تربیت دو مخالف قوتوں کی کشمکش میں ہوئی۔ نذیر احمد نوآبادیاتی ہندوستان میں مسلم قومی شناخت، تہذیبی کش مکش، نئی نسل کی نفسیاتی الجھنوں اور شخصی آزادی کے پیچیدہ تصورات کو پیش کرتے ہیں۔ آزادی اپنی شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتی ہے اور وہ خود کلامیاں کرتی ہے جن سے اس کی ذہنی کش مکش ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اپنی ماں کی مرضی سے ہار جاتی ہے اور ان کی مرضی سے شادی کرتی ہے۔ اس کا شوہر مولوی مستجاب اپنی روٹی مذہب سے کماتا ہے اور وہ اسے اس کام سے باہر نکالنا چاہتی مگر اُس کی اچانک پردیس میں موت ہو جاتی ہے اور اس کی موت کا تار آزادی کے نام آتا ہے۔ جس سے سب لوگ حیران ہوتے ہیں۔ آخر میں وہ معاشرتی ناانصافیوں پر لوگوں سے خطاب کرتی ہے۔

''ایامیٰ میں پہلی مرتبہ قاری نذیر احمد کے سماجی شعور سے واقفیت پیدا کرتا ہے۔ یوں تو ابن الوقت میں بھی نذیر احمد کے ان خیالات کا عکس موجود ہے جو وہ اپنے لیکچرز میں گاہے گاہے بیان کرتے رہے لیکن ایامیٰ میں آزادی بیگم کی صورت میں ہم اس عورت سے ملتے ہیں جو جدید اور قدیم کے سنگم پر کھڑی ہوئی عورت ہے۔ یہاں ڈپٹی صاحب کا معاشرہ بھی نگاہ میں آتا ہے کہ یہ معاشرہ بھی جدید اور قدیم کے سنگم پر کھڑا ہوا معاشرہ ہے۔ نذیر احمد کے دینی رویے کے تناظر میں ایامیٰ کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔''(13)

اخلاقی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے یہ ناول سماجی شعور، انفرادی خیالات اور ثقافتی اصولوں کے ارتقاء کے درمیان پیچیدہ تعامل کو بیان کرتا ہے اور یہ نذیر احمد کے فلسفۂ اخلاق کے تناظر میں روایت اور جدیدیت کے امتزاج کی نشاندہی کرتا ہے۔ آزادی بیگم کا کردار وسیع تر معاشرتی حرکیات کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ کردار ڈپٹی صاحب کے معاشرے کے اخلاقی رویوں کا آئینہ دار ہے جو روایت اور ترقی کے سنگم پر اسی طرح موجود ہے۔ اس ناول سے ایک پیچیدہ اخلاقی منظر نامے کی نشاندہی ہوتی ہے جہاں اقدار، عقائد اور طرز عمل اکٹھے ہیں۔ نذیر احمد کے مذہبی طرز عمل کے حوالے سے یہ ناول ان کی تحریر کی اخلاقی جہتوں کو اجاگر کرتے ہوئے ایک اور پرت کا اضافہ کرتا ہے۔ اخلاقیاتی نقطہ نظر کے لیے ایک پلیٹ فارم کے طور پر ایامیٰ کی اہمیت اخلاقی نمونوں کی تشکیل میں تاریخی، ثقافتی اور انفرادی عناصر کے باہمی ربط کو تسلیم کرنے کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ یہ اس بات پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ اخلاقی فلسفہ کو اس ہمیشہ بدلتے ہوئے تناظر میں قبول کرنا چاہیے تاکہ ایک ایسا اخلاقی رویہ قائم کیا جا سکے جو اخلاقی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے معاشروں اور افراد کی ضروریات اور ان کے وقار اور عزت نفس کو تسلیم کرے۔ بیوگی انسانی فطرت کو بدل نہیں سکتی اور بے جا معاشرتی پابندیاں انسان کے اندر خوف اور شرمندگی کا احساس پیدا کرتی ہیں اور وائے پچھتاوے کے کچھ باقی نہیں بچتا۔ اپنی آخری تقریر میں آزادی بیگم اس کا اظہار یوں کرتی ہے:

''لوگوں کی نظر میں اپنے تئیں بے گناہ ظاہر کرنا مجھ کو کیا فائدہ دے سکتا ہے جب کہ میں خوب جانتی ہوں کہ خدا کی سرکار اپنی بے گناہی کا یقین دلانا جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ چلتے چلتے ایک گناہ اور اپنے سر پر لوں مجھ پر ایک وقت گزرا ہے دن نہیں۔ ہفتے نہیں۔ مہینے نہیں۔ بلکہ پرائے مرد کی آواز میرے کانوں کو بھی معلوم ہوتی تھی۔ رات کو چوکیدار پکارتا یا دن کو سودے والے صدا لگاتے تو میں کان لگا کر سنتی بلکہ ایک دفعہ تو بے اختیار ہو کے ڈیوڑھی میں جا کھڑی ہوئی اور پھر مہینوں اپنے تئیں ملامت کرتی رہی۔''(14)

''رویائے صادقہ'' یہ ناول ۱۸۹۲ء کو پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا۔ یہ ناول مولوی نذیر احمد کا آخری ناول ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار صادقہ ہے۔ صادقہ

بکثرت خواب دیکھتی ہے اور خواب سچ ہوتے ہیں گویا وہ کوئی کراماتی مخلوق ہے۔ان خوابوں کی تعبیر میں بھی اسے ملکہ حاصل ہے یوں اس کے بارے میں یہ گمان مشہور ہو جاتا ہے کہ اس پر کسی جن کا اثر ہے۔اس لیے کوئی بھی گھرانہ اسے بہو کے طور پر قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔آخر کار علی گڑھ کا ایک طالب علم سید صادق بنارسی اس کا ہاتھ مانگتا ہے اور اس کے والد کو ایک تسلی بخش خط لکھتا ہے۔اس خط میں وہ اپنے مذہبی عقائد بیان کرتا ہے۔

اس ناول میں صادقہ کا ایک طویل خط ہے جو تریسٹھ صفحات پر مشتمل ہے جس میں صادقہ کے خیالات کی تفصیل ہے۔لڑکی کے والدین صادق کو قبول کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں تب صادقہ اپنی سہیلی کے ذریعے انھیں کہلواتی ہے کہ یہ رشتہ ضرور ہوگا کیونکہ میرا خواب یہی کہتا ہے۔ اس ناول میں مسلمانوں میں پردہ، عورت کی سماجی حیثیت، دوسرے مذاہب اور اہل کتاب عورتوں سے شادی اور اس شادی کے نتائج، حسب نسب کی اہمیت، شرم و حیا کی توصیف اور تجرد وغیرہ پر کھل کر بات کی گئی ہے۔شادی بیاہ کے سلسلے میں نئی نسل کے خیالات اور ان کا نفع و نقصان اور کثرت اولاد کی مخالفت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

"مسلمانوں کی طرف سے میں بالکل ناامید ہوں اور اسی میں ان کی بہتری سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ جہاں تک ممکن ہو اپنے شمار کو بڑھنے نہ دیں کیونکہ شمار کے ساتھ ساتھ مفلسی اور خواری بھی بڑھتی ہی جائے گی۔"(15)

یہ بیان ایک ایسے نقطہ نظر کی عکاسی کرتا ہے جو مسلم آبادی کے بڑھتے ہوئے خدشات کو سماجی اقتصادی چیلنجوں کے ساتھ جوڑتا ہے۔اخلاقی فلسفیانہ نقطہ نظر سے یہ نقطہ نظر کئی اخلاقی تحفظات کو سامنے لاتا ہے۔سب سے پہلے یہ شخصی آزادی اور سماجی ذمہ داری کے درمیان توازن پر سوال اٹھاتا ہے۔اگرچہ افراد کو تولیدی انتخاب کرنے کا حق حاصل ہے لیکن معاشرتی بہبود پر آبادی میں اضافے کے ممکنہ اثرات پر غور کرنے کی ایک اخلاقی جہت ہے خاص طور پر غربت کے خاتمے اور وسائل کی تقسیم کے معاملے میں۔ مزید یہ کہ یہ نقطہ نظر افادیت پسندی کے اخلاقی تصور کو بھی پیش کرتا ہے جو ان کی مجموعی افادیت یا خوشی پر افراد کی تعداد کے اثرات کا جائزہ لیتا ہے۔ وسیع تر سماجی، اقتصادی اور ثقافتی سیاق و سباق کی روشنی میں اس ناول میں پیش کیا گیا اخلاقی فلسفہ متعدد نقطہ ہائے نظر اور ممکنہ نتائج پر غور کرتے ہوئے پیچیدہ مسائل کے جامع تجزیہ کی حوصلہ افزائی کرتا اور انصاف، مساوات اور انفرادی حقوق کے اصولوں کو بھی برقرار رکھنے کے لیے آواز اٹھاتا ہے۔اس لیے انھوں نے جابجا مسلمان عوام اور اشرافیہ کے اخلاقی رویوں پر تنقید بھی کی ہے:

"دلی میں کتنے لوگ ایسے بیکار پڑے پھرتے ہیں جن کو دنیا اور دین کا کوئی کام کرنے کو نہیں۔ صبح ہوئی یہ خدا جانے کہاں رہے کوئی ڈیڑھ پہر رات جاتے جاتے بیوی کے ڈر سے گھر آئے۔ چھینکے پر سے روٹی اتار، مونڈھے تلے سے سالن کی پتیلی نکال، بچا کھچا کھا پی منھ لپیٹ پڑ رہے۔سویرے آنکھ کیا کھلے خاک۔غرض جیسے دیر کر کے سوئے تھے، ویسے ہی دیر کر کے اٹھے۔منھ ہاتھ دھویا، بالوں میں کنگھی کی، تیل ڈالا، سرمہ لگایا، پان کھا، چھڑی رومال ہاتھ میں لے چلتے ہوئے۔کسی کام سے نہیں، کسی خاص شخص کی ملاقات کو نہیں، جس کسی جان پہچان کے گھر جی چاہا جا موجود ہوئے۔"(16)

یہ اقتباس اخلاقی فلسفیانہ نقطہ نظر سے یہ انسانی وجود کی قدر اور مقصد پر غور کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔نذیر احمد کے عہد میں زیادہ تر لوگ غیر ذمہ دارانہ زندگی گزار رہے تھے جو سماجی مصروفیات اور مذہبی سرگرمیوں دونوں سے منقطع تھے اس لیے وہ ان کے اعمال کی معنی خیزی پر سوال اٹھاتے ہیں۔وہ لوگ دنیاوی اور بظاہر غیر پیداواری معمولات میں پھنسے ہوئے اور بامقصد سرگرمیوں سے عاری تھے جو ان کی اپنی زندگی یا وسیع تر معاشرے میں مثبت کردار ادا کر سکتی تھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اخلاقی اصولوں کے ساتھ مضبوط وابستگی اور معاشرے کے لیے ذمہ دارانہ اور منصفانہ انداز میں کام کرنے والے افراد کی اہمیت جتاتے ہیں۔اخلاقی مسائل کی ان کی بصیرت اور عصری معاشرے سے ان کی مطابقت کے لیے ان کے کارناموں کو آج بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد جب اپنے ناولوں میں اخلاقی رویوں کی بات کرتے ہیں تو وہ مکمل اعتماد اور یقین کے ساتھ کرتے ہیں۔وہ ناپسندیدہ رویوں سے نمٹنے اور اپنے قارئین سنجیدہ حکمتیں سکھانے سے گریز نہیں کرتے۔

"دراصل نذیر احمد کو ایک ایسے فرد کامل کی تلاش تھی جو جدید تعلیم سے آراستہ، روشن خیال، زمانے کے تقاضوں سے باخبر، اپنے مذہب کا پابند ہونے کے ساتھ اپنی تہذیب و معاشرت پر کاربند ہو چنانچہ اسی فرد کامل کو پیش کرنے کے لیے انھوں نے رویائے صادقہ لکھا۔اس ناول میں انھوں نے صادقہ کے ذریعے ایک تعلیم یافتہ نوجوان کے خیالات کی اصلاح کوشش کی ہے۔"(17)

یہاں اس ناول میں نذیر احمد کا اخلاقی فلسفہ اسلامی تعلیمات، خاص طور پر تقویٰ یا خدا شناسی، مروت، محبت اور ہمدردی کے تصور سے گہرے طور پر متاثر ہے۔ان کے ناولوں میں کرداروں کو اکثر ان مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو تقویٰ کی زندگی گزارنے کے لیے ان کے عزم کا امتحان ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر اس کے ناول مراۃ العروس میں اکبری کے شوہر محمد عاقل کا کردار جو اپنی بیوی کی حماقتوں کا سامنا کرتا ہے لیکن بالآخر شخصی فائدے پر اپنے اخلاقی اصولوں کو ترجیح دینے کا انتخاب کرتا ہے۔ کیونکہ ان کا اخلاقی نظریہ سماجی ذمہ داری کی اہمیت میں ان کے یقین سے تشکیل پاتا ہے۔ان کے ناولوں میں کرداروں کو اکثر نہ صرف ان کے انفرادی اعمال سے پرکھا جاتا ہے بلکہ اس بات سے بھی کہ ان اعمال کا وسیع تر معاشرے پر کیا اثر پڑتا ہے۔

نذیر احمد کا اخلاقی فلسفہ اس کے ناقدین تصورات کے ذکر کے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔ کچھ لوگ دلیل دیتے ہیں کہ تقویٰ اور اجتماعی ذمہ داری پر اس کی توجہ حد سے زیادہ توجہ اور زور گھٹن کا باعث ہے جو انفرادی خود مختاری اور تخلیقی صلاحیتوں کو محدود کرتی ہے۔ ان تنقیدوں کے باوجود ان کی قائم کردہ تخلیقی روایت اس عہد میں اسلامی اخلاقیات کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہے۔ ان کے ناول قارئین کو جدید مسلم معاشرے کی تشکیل میں مثبت اور تعمیری کردار ادا کرنے اور عصری مسائل پر غور کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اجتماعی ذمہ داری پر زور دینے کے باوجود نذیر احمد کا اخلاقی فلسفہ ضروری نہیں کہ انفرادی خود مختاری کو کم کرے۔ اس کے بجائے ان کا خیال تھا کہ انفرادی اخلاقی انتخاب وسیع تر سماجی تانے بانے کی تشکیل میں ایک لازمی کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ روح عصر کے شعور کو فروغ دینے سے افراد ایسے اخلاقی انتخاب کر سکتے ہیں جو ان کی اقدار کے مطابق ہوں اور ایک منصفانہ اور ہمدرد معاشرے کی تعمیر میں اپنا حصہ ڈالیں۔ نذیر احمد کے اخلاقی نظریے کا ایک اور اہم پہلو قومی اور سماجی ذمہ داری کو قبول کرنے پر زور دینا ہے۔ ان کے ناولوں میں کرداروں کا فیصلہ صرف ان کے انفرادی اعمال پر نہیں ہوتا بلکہ اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ ان اعمال کا وسیع تر معاشرے پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ دوسروں کی بھلائی کو ترجیح دے کر افراد ایک زیادہ ہم آہنگ اور مساوی معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔

نذیر احمد کے ناولوں میں پیش کی گئی زندگی کی تصویریں یک رخی ہیں اور نذیر احمد نے اپنا زور بیان کرداروں کے مثالی نمونوں کی تخلیق میں صرف کیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی مد نظر رکھنی چاہیے کہ سکوت دہلی کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی کے پیش نظر اس وقت مثالی کرداروں کو پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ واضح نظر آتا ہے کہ شبلی اور حالی نے جو قوت اسلاف کے تذکروں سے حاصل کی تھی وہی قوت نذیر احمد مثالی کرداروں کی تخلیق سے حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ نذیر احمد کے ناول چونکہ داستانوں کے تخیلی اسلوب سے ہٹ کر لکھے گئے تھے اور ان میں حقیقی زندگی کی جھلکیاں بھی موجود تھیں اس لیے انھیں وسیع طبقے میں قبولیت حاصل ہوئی اور ان ناولوں کے ذریعے علی گڑھ تحریک کی معتدل اور متوازن عقلیت کو زیادہ فروغ ملا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے سماج کی نہ صرف تصویر کشی کی بلکہ اسے درست رخ دینے میں بھی جی جان سے مصروف رہے۔ ایک اعلیٰ تخلیق کار کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں اپنے سماج کے حقیقی اور روز مرہ امور پیش کرنے کا پہلو غالب رکھتا ہو۔ اس اعتبار سے نذیر احمد بلاشبہ ایک سچے تخلیق کار کا درجہ رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

1 نذیر احمد، ڈپٹی، مراۃ العروس، لکھنؤ: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۰۶ء، ص ۱۳۷

2 سید عبداللہ، ڈاکٹر، سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقا، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۶ء ص ۲۱۱

3 نذیر احمد، ڈپٹی، بنات النعش، لکھنؤ: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۰۶ء، ص ۴۸

4 نذیر احمد، ڈپٹی، توبۃ النصوح، مرتب: پروفیسر افتخار احمد صدیقی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء، ص ۴۶۱

5 نذیر احمد، ڈپٹی، محصنات عرف فسانہ مبتلا، دہلی: دار الاشاعت مسلم منزل، ۱۹۸۵ء، ص ۴

6 نذیر احمد، مولانا، محصنات عرف فسانہ مبتلا، ۵۴

7 سید عبداللہ، ڈاکٹر، سر سید اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۶ء، ص ۲۳۰

8 https://www.rekhta.org/authors/deputy-nazir-ahmad/profile?lang=ur, 22-10-2019, 09:25PM

9 نذیر احمد، ڈپٹی، ابن الوقت، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۳ء، ص ۱۷۱

10 نذیر احمد، ڈپٹی، ابن الوقت، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۳ء، ص ۱۹۶

11 قاضی محمد، ثناللہ پانی پتی، تفسیرِ مظہری، ج ۲، لاہور: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص ۱۴۳

12 نذیر احمد، ڈپٹی، ایامیٰ، ترتیب وتدوین: ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۳ء، ص ۲۲

13 صائمہ ارم، ڈاکٹر، ڈپٹی نذیر احمد کا ایک کمیاب اور نظر انداز شدہ ناول۔ ایامیٰ، (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)، مشمولہ: تحقیق نامہ، مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر نسیمہ رحمٰن، والیم ۱۴ ، لاہور: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، جنوری ۲۰۱۴ء، ص ۵۳

14 نذیر احمد، ڈپٹی، ایامیٰ، ص ۲۲۸

15 نذیر احمد، ڈپٹی، رویائے صادقہ، دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۳ء، ص ۲۷

16 نذیر احمد، ڈپٹی، رویائے صادقہ، دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۳ء، ص ۷۹

17 امتیاز احمد علیمی، رویائے صادقہ کا تجزیاتی مطالعہ، https://urdufiction.in/mazamin_details?id=MTA=,24-10-2019, 103:0PM